ارشادِ نبوی کے حوالے سے ہی تو ہم کہتے ہیں کہ مشورہ لو مگر فیصلہ خود کرو کہ اپنی رائے پر عمل کرنا ہے یا دوسرے کے مشورہ پر!

مولانا امین احسن اصلاحی نے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے دورِ خلافت کے مشورے کے طریق کار کا بھی تذکرہ کیا ہے لیکن اس سے وہ جو کچھ ثابت کرنا چاہتے ہیں، ثابت نہیں ہوتا بلکہ جہاں شوریٰ کی پابندی ثابت کرنا چاہتے ہیں وہاں اس کے شروع میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں لکھتے ہیں: "خلیفہ بننے کے بعد انھوں نے تمام معاملات کا فیصلہ، جن کے بارے میں ان کو کتاب و سنت سے کوئی واضح ہدایت نہیں ملی ان لوگوں کے مشورے سے کیا جو جمہور مسلمین کے معتمد لیڈر تھے" یعنی ابوبکر صدیقؓ فیصلہ کن حیثیت کے حامل تھے دکھ صرف شورے کے پابند تھے۔ مولانا اصلاحی تو شاہ ولی اللہ کی تصنیف ازالۃ الخفا کا یہ حوالہ بھی درج کر جاتے ہیں کہ "اس معاملے میں تحقیق یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ تک فقہی اختلافات برپا نہیں ہونے پائے تھے جب کوئی اختلافی مسئلہ پیدا ہوتا تو لوگ خلیفہ کی طرف رجوع کرتے اور خلیفہ مشورہ کرنے کے بعد ایک رائے قائم کرتا اور وہی رائے اجتماعی فیصلے کی حیثیت اختیار کر لیتی۔"

## وزیرِ اعظم نہیں امیر، امیر کے امیر نہیں مشیر

اصل مسئلہ یہ ہے کہ مفتی عتیق الرحمان عثمانی اپنے مقالہ کے شروع میں ہی شوریٰ کو پارلیمانی نظام کے مترادف قرار دے بیٹھے ہیں اس لیے وہ امیر کو وزیرِ اعظم ثابت کرنا چاہتے ہیں جو پارلیمنٹ کے فیصلوں کا پابند ہوتا ہے اور شوریٰ کو پارلیمنٹ۔ جو مشورہ نہیں دیتی بلکہ فیصلہ کرتی ہے اس لیے انھوں نے تان یہاں توڑی ہے کہ "اگر امیر یا امام شوریٰ کے فیصلہ کو نظر انداز کر دیا کرے گا اور ذاتی و شخصی رائے پر عمل کرتا ہے گا تو یہ بات مجلس شوریٰ کے لیے ازالہ حیثیت عرفی کے مترادف ہوگی اور ایسے امیر اور ڈکٹیٹر میں کیا فرق رہ جائے گا" حالانکہ سیدھی سی بات ہے کہ مسلمانوں کا امیر اپنی رائے کو منوانے کے لیے اصرار نہیں کرتا بلکہ وہ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرح مشورے طلب کرنے پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ سن کر اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ امت کے اندر ایسے افراد موجود ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم محفوظ کیے ہوئے ہیں۔" (سنن دارمی بحوالہ اسلامی ریاست)

دوسری طرف حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے ایک مشیر حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ (چند فیصلوں کی وجہ سے) ہلاک ہو چکا ہوتا" اور یہ دعا کرتے ہیں کہ "اللہ وہ دن نہ لائے جب علیؓ رہنمائی کے لیے ہم میں موجود نہ ہوں" حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ کے سنت کے مطابق فیصلے کہ شراب نوشی کی حد چالیس کوڑے ہے، بلا چون و چرا قبول کر لیتے ہیں، چوتھے خلیفہ افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ مجھے وہ مشیر میسر نہیں آتے جو پہلے خلفا کو حاصل تھے! جب کہ ڈکٹیٹر یا آمر تو مجلس شوریٰ کا قیام ہی ضروری نہیں سمجھتا اس لیے امیر اور شوریٰ کا تصور بدلنے کی بجائے ضروری امر یہ ہے کہ اسلام کے امیر اور شوریٰ کے تصورؓ کو اس کے کھرے پن کے ساتھ پیش کیا جائے کیونکہ مسلمانوں کا امیر ہر کام میں مشورہ چاہتا ہے کہ اس کی مدد کی جائے اور مجلس شوریٰ اس سلسلے میں اس کی مدد کرتی ہے۔ مجلس شوریٰ کے ارکان امیر کے امیر نہیں بننا چاہتے۔ یہ اس لیے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ مشورہ دینے اور فیصلہ کرنے میں کیا فرق ہوتا ہے۔

## اصول بہرحال اصول ہوتے ہیں

مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تصنیف "اسلامی ریاست" میں پارلیمانی اور صدارتی نظام کو شورائی نظام سے یکسر مختلف قرار دینے کے باوجود امیر کو مجلس شوریٰ کا اس لیے پابند کر دینا چاہتے ہیں کہ انہیں خلفائے راشدین ایسے امیر سے واسطہ نہیں پڑا ....... اس لیے وہ اب ہر امیر کے لیے شوریٰ کی پابندی ضروری چاہتے ہیں مگر ذاتی تجربات سے اصول تو بدل نہیں جایا کرتے اور نہ ہی انہیں بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسلام تو کیا کسی بھی دوسرے مذہب یا معاشرہ نے یہ اصول نہیں دیا کہ جس سے جو مشورہ لو اس کی پابندی تم پر لازم ہو گی جبکہ اسلام تو یہ درس دیتا ہے کہ ـــ صحابہ کرام نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مشوروں (جو احکام نہ تھے) کو تسلیم نہیں کیا اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرز عمل کو غلط نہیں گردانا کیونکہ صحابہؓ بھی ہر معاملہ میں دریافت کر لیا کرتے تھے کہ یہ حکم ہے یا مشورہ، حکم ہے تو سر تسلیم خم ہے اور مشورہ ہے تو یہ اس لیے قبول نہیں۔ مشورہ کی پابندی ضروری نہیں، کے سلسلے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے واقعات تفصیل سے رقم کرنے کے بجائے صرف اشارہ کافی ہے بریرہ کے اپنے شوہر کھجوروں کے کم یا زیادہ ہونے اور لشکر کے

پڑاؤ کے سلسلے میں آپؐ کا مشورہ قبول نہیں کیا گیا بلکہ آپؐ کا فرمان ہے کہ "دنیا کے کام تم مجھ سے بہتر جانتے ہو، جب میں کوئی کام دین کا بتایا کروں تو اس کی پیروی کیا کرو۔" (بخاری)

## انصاف سے غیر منصفانہ سلوک!

وہ لوگ جنھوں نے جمہوریت کو اپنی مجبوری بنا لیا ہے انصاف سے غیر منصفانہ سلوک کرنے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس مقام پر وہ اصحاب (جسٹس کیکاؤس اور سید متین ہاشمی) بھی ان کے شریک فکر بن جاتے ہیں جو اسلام کے سیاسی نظام اور جمہوریت کو ایک دوسرے سے مختلف تو گردانتے ہیں اور جمہوریت کے خلاف فیصلہ بھی چاہتے ہیں لیکن ان کی سادگی دیکھیے کہ یہ بھی جمہوریت کی بنیاد کثرت رائے کو شورائی نظام کا ایک اصول قرار دے بیٹھے ہیں کہ اختلاف کی صورت میں کثرت رائے کا فیصلہ تسلیم کیا جائے گا۔ یہ اصحاب یہ اصول تو تسلیم کرتے ہیں کہ فیصلہ کرنے کا حق امیر کو حاصل ہے لیکن مجلس شوریٰ میں اختلاف کی صورت میں کثرت رائے کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کا اصول تسلیم کر کے پہلے اصول کی خود ہی نفی کر دیتے ہیں نہ جانے یہ اصحاب اس امر کو قطعی طور پر کیونکر نظر انداز کر گئے کہ اختلاف رائے کی صورت میں اسلام فیصلہ کرنے کا کیا اصول دیتا ہے۔ قرآن مجید اختلاف رائے کی صورت میں یہ اصول دیتا ہے کہ "اگر کسی شے میں تمھارا تنازع ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرو" (النساء: ۵۹) اور جہاں کتاب و سنت خاموش ہوں وہاں شاورھم فی الامر کے تحت امیر یہ فیصلہ کرے گا کہ اکثریت کی رائے قبول کرنی ہے یا اقلیت کی، کیونکہ فیصلہ کن حیثیت کثرت و قلت کو نہیں بلکہ اس رائے کو حاصل ہے جو وہ دیتے ہیں۔ قرآن مجید اختلاف رائے کے سلسلے میں ایک اور معیار بیان کرتا ہے وہ یہ کہ "پس آپ میرے ان بندوں کو خوش خبری دیجیے جو بات (قول) کو سنتے ہیں پھر وہ اس کتاب سے اچھی اور بہتر بات کا اتباع کرتے ہیں" (زمر: ۱۸) مولانا عزیز زبیدی نے لکھا ہے کہ گو — قول — سے بعض مفسرین نے قرآن کریم مراد لیا ہے لیکن یہ آیت کی ہمہ گیر وسعتوں کا ایک محدود مصرف ہے۔ دراصل دل آگاہ جب الحکم الحاکمین کی رضا کو سامنے رکھ کر یا اپنے آپ کو اس کا عبد تصور کر کے دنیا کی ساری باتوں کو تول تول کر لیتا ہے تو یہ "عبدیت" کی "معراج بریں" ہوتا ہے" — اب رہا اچھی بات کیا ہے تو اس سلسلے میں ہر شخص اپنے طور پر فیصلہ کر سکتا ہے کیونکہ حدیث ہے "اگرچہ دوسرے فتوے

دینے والے فتویٰ دے چکے ہوں تاہم آپ کو اپنے دل سے بھی پوچھ لینا چاہیے۔" (مسند احمد)
جہاں معاملہ امور مملکت کا ہو تو اس کا فیصلہ امیر شاورھم فی الامر کے تحت کرے گا۔ مولانا
اشرف علی تھانوی "بیان القرآن" میں اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ "امور انتظامیہ متعلقہ
بالرائے والمشورہ میں کثرت رائے کا ضابطہ محض بے اصل ہے ورنہ یہاں عزم میں یہ قید ہوتی کہ بشرطیکہ
آپ کا عزم کثرت رائے کے خلاف نہ ہو۔" امام ابن حزم تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ "شہود کے لحاظ سے
بھی عدد کا اعتبار صرف زنا، طلاق اور دیون میں کیا گیا ہے اور بس (الاحکام)

## آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟

کم از کم میں نہیں سمجھ سکا کہ اختلاف رائے کی صورت میں فیصلہ کیسے کیا جائے، کی واضح ہدایات
کے باوجود مولانا امین احسن اصلاحی نے یہ کیونکر لکھ دیا کہ خلفائے راشدین کے زمانہ کی کوئی ایک
مثال بھی ہمارے سامنے ایسی نہیں جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ انھوں نے کسی قابل مشورہ امر
میں لوگوں سے مشورہ کیا اور پھر ان کے متفق علیہ یا ان کی اکثریت کے خلاف قدم اٹھایا ہو۔"
(اسلامی ریاست ص۳۳) تو پڑھیے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت علی مرتضیٰؓ اور حضرت عبدالرحمٰن
بن عوف کی رائے کے مقابلے میں حضرت عثمانؓ کی رائے پر عمل کیا اور وہ بہت بڑی اہم شخصیتیں
اور ان کی اکثریت کی پروا نہیں کی۔" امام ابن حزم اپنی تصنیف "الاحکام فی اصول الاحکام"
کے ص۱۸ میں لکھتے ہیں کہ ایک لونڈی جو ابھی آزاد ہوئی تھی اس پر حد قائم کرنے کا مسئلہ آگیا:
"اس پر حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ اور حضرت عثمانؓ سے کہا کہ مجھے
اس حکم میں مشورہ دو چنانچہ حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے کہا کہ ہماری
رائے میں اس کو سنگسار کرنا چاہیے۔ اس کے بعد آپ نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ آپ بھی
مشورہ دیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ آپ کے دونوں بھائیوں نے آپ کو مشورہ دے ہی دیا ہے
حضرت عمرؓ نے فرمایا میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ آپ مجھے مشورہ سے ضرور مطلع کریں۔ انھوں نے
کہا میری رائے تو یہ ہے کہ حد اس پر جاری کی جائے جو اپنے جرم کی نوعیت سے بھی واقف ہو۔
حالانکہ میں دیکھتا ہوں کہ اس نے اس کا یوں ڈنکے کی چوٹ اعتراف کیا ہے جیسا کہ اس میں
کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا بخدا آپ نے سچ فرمایا ہے۔ سنگساری
کی حد اس پر لگنی چاہیے جو جرم کی نوعیت کو سمجھتا ہو چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس کو سو کوڑے

لگانے اور ایک سال کے لیے جلاوطنی کا حکم دے دیا۔

ممکن ہے بعض حضرات حضرت عمرؓ کے ایک نامکمل ارشاد کی بنا پر غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ وہ اکثریتی فیصلوں کو درست قرار دیتے تھے تو اس سلسلے میں اختصار کے ساتھ عرض ہے کہ حضرت عمرؓ نے جہاں یہ فرمایا ہے کہ "اگر (اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ مقرر کرنے والے چھ اصحاب) اختلاف کریں تو اکثریت کی پیروی کی جائے"۔ اس کے ساتھ ہی ارشاد ہے کہ "اگر طرفین برابر ہوں تو میرا بیٹا ثالث ہوگا لیکن عبداللہؓ ادھر ہوگا جدھر عبدالرحمٰنؓ بن عوف ہوں گے"۔ (تاریخ ابن خلدون) طبری میں ہے کہ "اگر تین ایک طرف ہوں اور تین ان کے مخالف ہوں تو میرے بیٹے عبداللہؓ کو ثالث مقرر کر لینا اور جس فریق کے حق میں عبداللہؓ فیصلہ کرے اس میں کا ایک شخص خلیفہ بنا لینا اور اگر عبداللہ کے فیصلے سے لوگ راضی نہ ہوں تو پھر تم سب اس طرف ہونا عبدالرحمٰنؓ بن عوف جس طرف ہوں"۔

خلیفہ مقرر کرنے کے سلسلہ میں یہ تمام ہدایات شاہد ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اکثریت کا ذکر ایک اصول کے طور پر نہیں کیا ورنہ وہ حضرت عبداللہؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو فیصلہ کن حیثیت نہ دیتے۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے اسلامی ریاست کے صفحہ ۳۳، ۳۴ میں یہ بھی لکھا ہے کہ "خلفاء راشدین تو درکنار خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ آپؐ نے جس معاملہ میں لوگوں سے مشورہ لیا، اس میں اکثریت کے فیصلہ کے مطابق ہی عمل کیا کوئی ایک مثال بھی اس کی خلاف ورزی کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول نہیں ہے"۔ یہ دعویٰ پڑھنے کے بعد یہ بھی پڑھ لیجیے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوہ بدر کے قیدیوں کے بارے میں صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے رائے دی کہ انھیں فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے" (تفسیر ابن کثیر) تفسیر ابن کثیر میں ہی حضرت عمرؓ فاروق کی یہ رائے درج ہے کہ ہر ایک قیدی کو اس کے عزیز کے حوالہ کیا جائے اور وہ اس کی گردن اڑا دے"۔ عبداللہ بن رواحہؓ نے کہا "میری رائے تو یہ ہے کہ ان سب کو کسی ایسی وادی میں داخل کیا جائے جہاں سوختہ زیادہ ہو اور پھر اس میں آگ لگا دی جائے" (درمنثور) ابن جریر نے بروایت محمد ابن اسحاق نقل کیا ہے کہ سعدؓ بن معاذ کی یہ رائے تھی کہ سب کو قتل کر دیا جائے"۔ (تفسیر روح المعانی) لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عبداللہؓ بن رواحہؓ اور حضرت سعدؓ بن معاذ

کی رائے (جو کہ اکثریت کی رائے تھی) کے برعکس حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رائے کے مطابق فیصلہ فرمایا (روح المعانی جلد دوئم ص۲۶)

بخاری میں ہے کہ صلح حدیبیہ میں جب سہیل نے یہ شرط بھی لگوائی کہ اگر ہم میں سے کوئی آدمی آپؐ کے پاس چلا جائے اور وہ مسلمان ہو گیا ہو تو آپؐ اس کو ہماری طرف واپس کر دیں ہم جو چاہیں اس کے ساتھ کریں۔ سہیل نے کہا میں تو اسی شرط پر صلح کروں گا اور مسلمانوں نے اس شرط کو برا مانا اور ناراض ہوئے۔ انھوں نے گفتگو کی (کہا کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کو کافروں کے سپرد کر دیں) سہیل نے کہا یہ نہیں ہو سکتا تو صلح بھی نہیں ہو سکتی۔ آخر کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ شرط منظور کر لی اور صلح نامہ لکھوایا۔" فرمائیے کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کی رائے (برا ماننا اور ناراضگی) کی کوئی پروا کی۔ بخاری میں ہی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسامہ کو لشکر کا سردار بنایا اس پر لوگوں نے باتیں بنائیں (کہنے لگے کہ بوڑھوں کو چھوڑ کر آپؐ نے ایک چھوکرے کو سردار بنایا ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا ـــــ میں نے سنا تم لوگ جو باتیں اسامہؓ کے باب میں کرتے ہو! دیکھو اسامہؓ مجھے سب لوگوں سے زیادہ پیارا ہے"۔ بلکہ آپؐ نے خطبہ دیا جس میں فرمایا "اگر تم اسامہؓ کی سرداری پر طعنہ مارتے ہو (تو کچھ تعجب نہیں) اس سے پہلے تم اس کے باپ (زیدؓ) کی سرداری پر طعن کر چکے ہو۔ قسم خدا کی وہ سرداری کے لائق تھا اور سب لوگوں سے مجھے پیارا تھا اس کے بعد یہ اسامہؓ (اس کا بیٹا) سب لوگوں سے مجھے پیارا ہے" (بخاری) اب بتائیے کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسامہؓ اور ان کے والد زیدؓ کو لشکر کا سردار بناتے ہوئے لوگوں کی رائے کو نظر انداز نہیں کر دیا تھا۔ صلح حدیبیہ اور لشکر اسامہؓ کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر دو مقام پر اعتراض کرنے والوں کی تعداد اکثریت کا درجہ حاصل نہیں کر سکی، لیکن اس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ صرف چند ایک صحابہ کی کوئی سی رائے یہ نتیجہ نہیں پیدا کر سکتی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے "انتخاب" کے سلسلہ میں خطبہ دینا پڑے اور ناراضگی کا اظہار کرنا پڑے۔ دوسری طرف حدیبیہ میں یہ تک کہنا پڑے۔ "میں اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسولؐ ہوں، میں اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا" (حیاۃ محمدؐ، محمد حسین ہیکل) اس کے باوجود جب صلح حدیبیہ طے پا جاتی ہے تو پھر بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سوا باقی تمام

مسلمان حضرت عمرؓ کی رائے کے حامی نظر آتے ہیں (فتح الباری) یہاں تک کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب قربانی کرنے کا حکم دیا تو کوئی بھی مسلمان قربانی کرنے کے لیے کھڑا نہ ہوا اور آپؐ نے تین مرتبہ حکم دیا پھر بھی یہی ردِ عمل ظاہر ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ جنگ احد باہر لڑنے کا فیصلہ بھی کثرت رائے کی بجائے عزم رسولؐ کے تحت ہوا ہے کیونکہ جس اکثریت نے باہر لڑنے کا مشورہ دیا تھا وہ بھی بزرگوں کے سمجھانے پر اپنے موقف سے دستبردار ہو گئی تھی اور واضح الفاظ میں عرض کی تھی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاں چاہیں لڑائی لڑنے کا فیصلہ کریں تو آپؐ نے فرمایا کسی نبی کو لائق نہیں کہ وہ زرہ پہن کر اتار دے جب کہ خدا فیصلہ نہ کر دے (فیض الباری)

میں ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے یہ حقیقت رقم کرنے میں تذبذب محسوس نہیں کرتا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی ایک ایسی کتاب کی طرح ہم سب کے سامنے ہے جس کے کسی بھی ایک صفحے پر کسی بھی جگہ انگلی رکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی بھی کوئی فیصلہ صرف اس لیے کیا کہ "اکثریت" اس موقف کی حامی تھی۔

## مجبوری کی زنجیریں اور اصولوں کا خون

مشورے کی غرض وغایت اور اس کے درست طریق کار کو شعوری یا غیر شعوری طور پر تسلیم نہ کر کے ہم جمہوریت کی دیگر قباحتوں کو بھی سینے سے لگانے پر مجبور ہی نہیں ہو جاتے بلکہ ہمیں اپنی مجبوری کے ساتھ ساتھ ان قباحتوں کا احساس تک نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ جمہوریت پر ایمان لانے والا مسلمان طبقہ جمہوریت کی ہر قباحت کو خوبصورت تصور اور نکتہ ثابت کرنے میں مصروف ہے۔ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ مشورہ ان سے لیا جاتا ہے جو اس کے اہل ہوں تو ارشاد ہوتا ہے آخر ہمارے پاس کون سی کسوٹی ہے جسے استعمال کر کے ہم معلوم کر سکیں کہ کون مشورہ دینے کا اہل ہے۔ یہ دلیل اتنی مضحکہ خیز ہے کہ اسے جھٹلانے اور غلط قرار دینے کے لیے دلائل دینا ہی وقت کا ضیاع ہے کیونکہ ہر شخص کو ہر روز مختلف امور میں مشورے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ مشورہ لیتا ہے آخر کس کسوٹی سے اپنے مشیروں کو پرکھتا ہے کیا وہ ہر کام کے سلسلے میں ہاتھ کھڑے کراتا ہے اور انہیں گن کر فیصلے کرتا ہے۔

ہر فرد سے مشورہ لینے کے ضمن میں سورہ النور کی آیت نمبر ۵۵ کا حوالہ دیا جاتا ہے جس میں